قمیض سے چاقو پونچھ کر صاف کیا ، اور قمیض دوبارہ اُس کے مُنہ پر دبا دی ۔ پھر میں نے چادر اپنے گرد لپیٹ لی ۔ میرے کپڑوں پر اِس بار صرف چند ہی چھینٹے خون کے پڑے تھے ، جنہیں میں نے بآسانی چادر کے اندر چُھپا لیا ۔ صرف میرے ہاتھ تھے جو خون میں لتھڑے تھے ۔ اُنہیں میں نے چادر کے نیچے ڈھکے رکھا ۔ نکلنے سے پہلے میں نے ایک نظر پیرمغوں پر ڈالی ۔ اَیسے خوبصورت پیڑھے میں نے کبھی نہ دیکھے تھے ۔ علی محمد نے اپنی ساری محبّت کا زور اُس کاریگری پہ لگا دیا تھا ۔ دوکان سے نکل کر مَیں نے دروازہ بند کیا اَور جاتے جاتے باہر سے اُس کی کُنڈی لگا دی ۔ تانگے والے کو پیسے دیتے ہوئے مجھے دِقت کا سامنا کرنا پڑا ، مگر کسی نہ کسی طرح چادر کے اندر سے ہی میں نے نقدی اُسے پکڑا دی ۔ اِس طرح شام ہونے تک میں گھر پہنچ گئی" ۔

احمد شاہ کی پریشانی اب برہمی کی حالت کو پہنچ چُکی تھی ۔ اُسے موقع مِلا تو بولا ۔ "یہ کیسی بک بک لگا رکھی ہے ۔ اَیسی لچر باتوں کو دُہرا کر بخشش مانگتی ہو ؟ اپنی آخرت تباہ کر رہی ہو ، ساتھ میرا ایمان بھی خراب کرتی ہو ۔ اگر کچھ بتانا ہی ہے تو یہ بتا کہ تُو نے یہ اقدام کِس واسطے کئے ؟"

"بخشش کا کِسے عِلم ہے میاں جی ،" رضیہ سلطانہ بولی ، "وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ مَیں تو صرف اپنے بدن سے اس زہر کو دھونا چاہتی ہُوں ۔ اب آخری حال بیان کرنا رہ گیا ہے ، وہ بھی سُن لیں ۔ اس کے بعد میری جان آسانی سے نکلے گی ۔ اللہ آپ کو اِس کی جزا دے گا ۔"

"بول ، بول ، ختم کر اِس گندی کہانی کو ۔ یہ بتا کہ کِس وجہ سے تُو نے بے گناہوں کی جان لی ؟"

"بہت اچھا ، میاں جی ،" رضیہ سلطانہ نے اِلتجا کی ، "جلدی ختم کر دوں گی ۔ اللہ صبر کی تلقین کرتا ہے ۔ مَیں نے بہت صبر کیا ہے ۔ اب آپ کچھ صبر کر لیں ۔ خُدا اجر دے گا ۔ بس ایک آدمی کا حال بیان کرنا رہ گیا ہے ۔ آپ کو تو علم ہی ہے ، اُس کا نام چوہدری اکرم تھا ۔ چوہدری اکرم تیسرا دی تھا ۔ اُس کے پیچھے مجھے سب سے بڑی مُشکل کا سامنا کرنا پڑا ۔ تاہم اُس کا کام سب سے زیادہ آسانی سے تمام ہوا ۔ مُشکل یہ پڑی کہ وہ جہلم کی ایک کپڑے کی مِل میں کام کرتا تھا ، چُھٹی پر گاؤں آیا ہوا تھا ، چند دِن کے بعد بیوی بچوں کو لے کر واپس نوکری پر چلا گیا ۔ اُس کا پتا لگانے میں مجھے کافی عرصہ لگ گیا

تھا ، مگر آخر علی محمد کے ذریعے ہی بہانے بہانے سے مَیں اُس کا پتا نکال چکی تھی ۔ اُس روز مَیں علی محمد سے فارغ ہو کر گھر پہنچی تو رات کو ریل گاڑی پر سوار ہو کر جہلم کو روانہ ہوگئی ۔ رات کا آخری حصہ مَیں نے ویٹنگ روم میں گزارا ۔ صُبح سویرے تانگہ لے کر شہر سے ایک میل دُور کپڑے کی مِل پہنچی ۔ سب سے بڑی مُشکل یہ تھی کہ مُجھے چوہدری اکرم کے گھر کا پتا معلوم نہ ہو سکا تھا ۔ صرف یہاں تک عِلم ہوا تھا کہ وہ مُستقل رات کی شِفٹ پر کام کرتا ہے ۔ چُنانچہ مُجھ کو مِل کے باہر ہی پُہنچ کر اُس سے مٹھ بھیڑ کرنا تھی ، اور کوئی راستہ نہ تھا ۔ مَیں صُبح کے پانچ بجے مِل کے دروازے کے سامنے جاکر سڑک کی دوسری طرف کھڑی ہوگئی ۔ وہاں پہ دو تین دوکانیں تھیں جو ابھی کھلی نہ تھیں ۔ کچھ دیر کے بعد مَیں ایک دوکان کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر جا بیٹھی ۔ جب چھ بجے کا ہُوٹر ہوا تو رات کی شِفٹ کے لوگ مِل سے نِکلنا شروع ہوئے ۔ چائے اور بیکری کی ایک دوکان بھی کُھل گئی تھی ۔ کچھ لوگ وہاں جمع ہو کر چائے کی پیالیاں پینے لگے ، کچھ ڈبل روٹیاں ، بند اور رس خرید کر گھروں کو روانہ ہوئے ۔ مَیں مِل سے نِکلتے ہوئے ایک ایک ورکر کے چہرے کو دیکھ رہی تھی ۔ آخر ایک چھوٹے سے ٹولے میں مُجھے چوہدری اکرم کا چہرہ نظر آگیا ۔ اُس نے ہاتھ میں پیتل کا ٹِفن کیریئر اُٹھایا ہوا تھا ۔ وہ اپنے ٹولے کے چند لوگوں کے ہمراہ جاکر بس سٹاپ پر ٹھہر گیا ۔ وہاں پہ وہ چند آدمی بس کا انتظار کرنے لگے ، باقی کے سلام دُعا لے کر گھروں کو چل دیے ۔ چوہدری اکرم کے واسطے مَیں نے پہلے سے سکیم تیار کر رکھی تھی ۔ مُجھے عِلم تھا کہ وہ چالیس سالہ مُتقی پرہیزگار اور بیوی بچوں والا آدمی تھا ، اُس کے ساتھ پُرانے ہتھکنڈے نہ چلیں گے ۔ مزید وقت ضائع کئے بغیر مَیں اُس کے پاس پہنچی ۔ اُسے مخاطب کر کے مَیں نے کہا کہ میں چک اٹھاسی کی رہنے والی ہوں اور سرائے عالمگیر کسی کام سے آئی ۔ آج وہاں سے جہلم کے اڈے کی طرف آ رہی تھی تاکہ بس لے کر واپس گھر جاؤں ۔ صُبح سویرے کوئی سواری نہ مِل سکی اِس لِئے پیدل ہی چل کر پُل پار کر رہی تھی کہ میرا سات سال کا بچہ دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھا کر گِر پڑا ۔ اُس کا سر پُل کے جنگلے سے لگ کر پھٹ گیا ۔ مَیں نے روتے روتے دوپٹہ پھاڑ کر اُس کا زخم بند کیا ، مگر وہ تقریباً بیہوشی کی حالت میں تھا ، اور اُسے اُٹھا کر چلنے کی میرے اندر ہمت نہ تھی ۔ کاروں بسوں کو ہاتھ دیے ، کسی نے نہ روکا ۔ آپ کو

وہیں چھوڑ کر بھاگتی ہوئی اڈے پر آئی ، بازار میں دُہائی دی ۔ فجر کا وقت تھا ، لوگ سوئے پڑے تھے ، کوئی کوئی آدمی دکھائی دیتا تھا ۔ پوچھنے کو آتے تھے ، مگر ساتھ چلنے کو کوئی رضامند نہ ہوتا ۔ خوش قسمتی سے مجھے آپ کا خیال آگیا ۔ رکھوال میں میری رشتے داری ہے ، مَیں نے سُن رکھا تھا کہ چوہدری اکرم یہاں کپڑے کی مِل میں کام کرتے ہیں ۔ مَیں سیدھی یہاں چلی آئی ہُوں ۔ آپ سے مدد کی بِھیک مانگتی ہُوں ، میرے بچے کی جان بچا لیجئے ۔

میری داستان سُن کر چوہدری اکرم نے شک کی نظروں سے مُجھے دیکھا ۔ اگر وہ غور کرتا تو میری کہانی کے سقم اُسے نظر آجاتے ، مگر مجھے ایسا واویلا کرتے دیکھ کر اُس کا دِل پسیج گیا ۔ آخر مَیں اُس کے علاقے کی عورت تھی ، اُس کے آگے ہاتھ پھیلا رہی تھی ۔ اُس کے ساتھ والے لوگوں نے بھی کہنا سُننا شروع کر دیا تھا ۔ چند منٹ کے بعد وہ ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا ۔ اُسی وقت بس آگئی ۔ ہم بس میں سوار ہوگئے ۔ بس کا آخری سٹاپ پُل کے اِس کنارے پر تھا ۔ وہاں سے اُتر کر ہم پیدل پُل پر چل نکلے ۔ اِس سارے عرصے میں مَیں نے اپنی چادر اِس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ جسم کے علاوہ سر اور مُنہ بھی ڈھکا ہوا تھا ۔ صرف میری آنکھیں ننگی تھیں ۔ ہم جیسے ہی پُل پہ چڑھے مَیں نے چادر کے بَل ڈِھیلے کئے اور چہرہ ننگا کر دیا ، پِھر چلتے چلتے آدھے سِینے تک چادر ہٹا دی ۔ چوہدری اکرم نے ایک نظر مُجھ پہ ڈالی تو پِھر بار بار دیکھنے لگا ۔ مَیں نے اپنے دُکھ بھرے چہرے کا تاثر بدلے بغیر دو ایک بار ایسی نظروں سے اُسے دیکھا جیسے کہ ایک عورت ہی مرد کو دیکھ سکتی ہے اور جانتی ہے کہ یہ نظریں رائیگاں نہیں جائیں گی ۔ وہ اپنا کام دِکھا گئیں ۔ چوہدری اکرم پہلے سے زیادہ ... کے ساتھ ہمدردی جتانے اور تیز تیز چلنے لگا گویا مُجھ سے زیادہ اُس کو میرے بچے کی فِکر ہو ۔ چلتے چلتے میں اُسے اُس جگہ پر لے گئی جہاں دریا ایسا چڑھا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا پُل کے ساتھ ٹکرا کر بہہ رہا ہے ۔ دِن چڑھ آیا تھا ۔ ... اور کاروں کا کچھ ٹریفک شروع ہو چُکا تھا ، گو پیدل آدمی کوئی کوئی ہی ... دیتا تھا ۔ کچھ دُور ہی سے میں نے دوڑنا بھاگنا اور واویلا کرنا شروع کر دیا کہ یہاں میرا بچہ تھا ، غائب ہوگیا ہے ۔ اُس مقام پر میں پُل کے جنگلے سے لٹک کر نیچے پانی میں دیکھنے لگی ، جیسے میرا خیال ہو کہ بچہ دریا میں گر کر ڈوب چُکا ہے ۔

چوہدری اپنا ٹفن وہیں رکھ کر دونوں ہاتھوں سے مجھے پیچھے کی طرف کھینچنے اور ساتھ ہی میری طرح آگے لٹک لٹک کر دیکھنے لگا ۔ میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی ۔ پُل پہ اُس وقت ہمارے آس پاس کوئی ٹریفک نہ تھی ۔ میں نے چوہدری اکرم کا ٹفن کا ڈبہ اُٹھا کر پورے زور سے جو اُس کے سر کے پچھلے حِصے پہ مارا تو وہ چکر کھا گیا ۔ اِسی چکر میں وہ کچھ سُن سا ہو کر پُل کے جنگلے پر آدھا اِدھر اور آدھا اُدھر لٹکنے لگا ، گو جنگلے پہ اُس نے اپنی گرفت نہ چھوڑی ۔ میں اُس کے پیچھے کھڑی تھی ۔ ایڑیوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور دوسری طرف اُلٹ دیا ۔ چوہدری اکرم کے ہاتھ جنگلے سے چُھٹ گئے اور وہ نیچے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا میں جا گِرا ۔ میں نے اُسی وقت دہائی دینی شروع کر دی ۔ پُل کی دوسری جانب جا کر دیکھا ۔ صرف ایک بار وہ پانی کی سطح سے اُبھرا ، پِھر غائب ہوگیا ۔ آخر میں صرف ایک لمحے کے لِئے اُس کا ایک ہاتھ میں نے پانی سے باہر نِکلا ہوا دیکھا ، پِھر وہ بھی ڈوب گیا ۔ کچھ لوگ ہم سے دُور پُل پر جا رہے تھے ، میری پُکار سُن کر دوڑتے ہُوئے آئے ۔ پُل کی گارڈ سے ایک سپاہی بھاگ کر آیا ۔ میں نے کہا میرا بھائی تھا ، ڈوب گیا ہے ۔ کچھ لوگ دوڑے بھاگے ، مگر بپھرے ہوئے دریا کے مقابل کیا ہو سکتا تھا ۔ سپاہیوں نے مجھے تسلی تشفی دی ، حادثے کی خبر اِدھر اُدھر بھیجی ، میرا بیان لیا ، گواہ لکھے ، اَور مجھے تانگے پہ بٹھا دیا ۔ میں اُسی رات کو ریل پہ سوار ہو کر واپس لاہور آگئی ۔ "

احمد شاہ اِس حالت کو پہنچ چُکا تھا کہ گِڑگڑانے پہ آگیا ۔ اُس نے رومال مُنہ سے ہٹا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے ۔

"بی بی ، یہ میرے ہاتھوں کی طرف دیکھ ،" وہ بولا ، "اِس کہانی کو اب ختم کر ۔ کیوں اپنے اُوپر گناہ چڑھاتی ہے اَور ساتھ ہمیں بھی گناہگار کرتی ہے ۔ بس توبہ کر اَور اپنے گناہوں کی معافی مانگ ۔ ہاں اِتنا بتا کہ اِن بے گناہوں کا خون تو نے اپنے سر کیوں لیا ۔ کیا وجہ تھی کہ تُو اِن جرائم کی مُرتکب ہوئی ۔ ہم سب اکٹھے بیٹھ کر تیری بخشش کے واسطے دُعا کریں گے ۔ "

"بس میاں جی ،" رضیہ سلطانہ بولی ۔ "یہ کہانی اب ختم ہوئی ۔ باقی رہ گئی وجہ ۔ وجہ کا آپ کو پتا ہی ہے ۔ "

"وجہ کا پتا ہے ؟" احمد شاہ حیرانی سے بولا ۔ "کِس وجہ کا پتا ہے ۔ " ... کا مُنہ

ایسے بند ہو گیا گویا اب کبھی نہیں کھلے گا ۔
"مجھے کسی وجہ کا پتا نہیں لڑکی،" احمد شاہ غصّے سے بولا ۔ "بتا کیا وجہ تھی ۔ بول ۔"
چند لمحے کے توقف کے بعد رضیہ نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا، "انہوں نے میرے بچے کی جان لی تھی ۔"
"بچے کی ؟ کس بچے کی ؟" احمد شاہ متعجب ہو کر بولا ۔
"پچھلے نومبر کے مہینے کو یاد کرو ۔ ستائیس تاریخ تھی ، اور فجر کا وقت تھا ۔"
احمد شاہ یکایک بوکھلا کر ہکلانے لگا ۔ "ستائیس ؟ فجر کا وقت ۔ ۔ ؟"
"اس بچے کو یاد کرو میاں جی جس کو آپ کی مسجد کی سیڑھیوں پر پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا ۔"

"کون ۔ کہاں ؟ میں نے نہیں مارا ۔ ۔" احمد شاہ پریشانی میں بولا ۔
"درست کہتے ہو آپ نے نہیں مارا ۔ مگر انگلی کس نے اُٹھائی ؟ رضیہ سلطانہ نے کہا، "میں نے اُسے آپ کی اور خدا کی جھولی میں ڈالا تھا ۔ نو مہینے تک کیسی کیسی مشکلوں سے میں نے اپنے پیٹ کو چھپائے رکھا ۔ مجھے دنیا کا ڈر نہیں تھا، ایک ہی خدشہ تھا کہ میرا باپ پہلے ہی فالج کا مریض ہے، اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے گا ۔ جس روز میرے درد شروع ہوئے میں تانگے پہ بیٹھ کے رکھوال کو آئی ۔ شام کا وقت تھا ۔ گاؤں کے باہر تانگے کو چھوڑا اور ایک کماد کے کھیت میں گھس گئی ۔ کھیت میں داخل ہوتے ہی میرا پانی چھوٹ گیا ۔ رات کے کسی وقت وہیں پہ میں نے مویشیوں کی طرح کانپ کانپ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنے بچے کو جنم دیا ۔ صبح ہو رہی تھی جب میرا بدن کانپنا بند ہوا ۔ ہوش میں آئی تو دیکھا کہ میں نے بچے کو سینے سے لگایا ہوا ہے، مگر اس کا ناڑ ابھی اس کے پیٹ کے ساتھ جڑا ہے ۔ میں نے قینچی سے اُس کا ناڑ کاٹا تو اُس وقت میرے دل کو ایک ایسا دھچکا لگا کہ میرا جی چاہا بچے کو لے کر گھر واپس بھاگ جاؤں ۔ مگر کیا کرتی، قدم اُٹھا چکی تھی ۔ کیا بتاؤں احمد شاہ، اپنے بچے کو میں نے زبان سے چاٹ چاٹ کر صاف کیا، دیکھو اس زبان سے میں نے بچے کے بدن کو پاک کیا، صاف چادر میں لپیٹا ۔ دِل میں خیال آیا کہ اس کے کان میں اذان دوں ۔ مگر مجبور تھی ۔ ایک تو عورت ذات تھی، پھر ناپاک تھی ۔ نہ اذان کا حق میرے

2009/08/27 22:03

پاس تھا، نہ میری حالت ہی ایسی تھی ۔ ہاں ایک بات سے باز نہ رہ سکی ۔ باہر نکلنے سے پہلے اپنی پھاتی اُس کے منہ میں دے کر اُسے دودھ کے چند گھونٹ پلا دیے ۔ میرے دل کو کچھ تسلی ہوئی ۔ ابھی پَو نہ پھٹی تھی کہ میں مسجد تک پہنچی، آخری بار اپنے بچے کا منہ چوما، اور اسے سیڑھیوں کی اینٹوں پر رکھ دیا ۔ میں جانتی تھی کہ آپ لاولد ہو چکے ہیں ۔ آپ کا حق تھا ۔ میرے دل میں یقین تھا کہ آپ اسے خدا کی دین سمجھ کر اٹھالیں گے اور اپنی بیوی کی گود میں جا ڈالیں گے ۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ کے سینے کے اندر ایک شیطان بیٹھا ہے ۔ ہائے میں نے غلطی پر غلطی کی، وہاں بیٹھی رہی ۔ میں تہیہ کر چکی تھی کہ ایک بار اپنے دل کے ٹکڑے کو ہاتھ سے چھوڑ دونگی تو پھر مڑ کے نہ دیکھونگی ۔ مگر کیا کرتی، چل نہ سکی، قدم زمین سے چمٹ گئے ۔ واپس چلی جاتی تو یہ دن نہ دیکھتی ۔ آخر مسجد کے سامنے مکئی کے کھیت میں جاکر بیٹھ رہی اور سیڑھیوں پہ رکھی اُس سفید گٹھڑی کو دیکھتی رہی، حتّٰی کہ فجر آن لگی اور آپ کی شکل مجھے وہاں کھڑی نظر آئی ۔ احمد شاہ، مجھے کس گناہ کی سزا ملی ۔ میں چلی جاتی تو نہ تیری منحوس شکل دیکھتی، نہ تین بے گناہوں کی جان جاتی ۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مُراد اور علی محمد اور چوہدری اکرم وہاں نماز پڑھنے آپہنچے ۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ نے واہی تباہی بکنا اور اُنگلی اُٹھا اُٹھا کر میرے بچے کی جانب اشارے کرنا شروع کر دیا ۔ جو الفاظ میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے اُن میں حرامی، اور ناجائز اور اولاد ، اور مسجد اور بے حرمتی کے لفظ بار بار آتے تھے ۔ اُس وقت میرے دل میں موت کا ہول اُٹھ رہا تھا، مگر میں سوچ رہی تھی کہ بچے کو کچھ اور دودھ پلا دیتی تو اچھا تھا، اُسے بھوک لگ رہی ہوگی ۔ اور سوچ رہی تھی کہ ابھی پیشاب کرے گا تو اس کی چادر کو کون بدلے گا، اُسے سردی نہ لگ جائے، اور سوچ رہی تھی کہ اُس کا نام کیا رکھا جائے، سنت کب ہوگی، اور خیال کر رہی تھی کہ اگر میں اُس کے کان میں اذان کی آواز پہنچا دیتی تو اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھتا، عورت ذات اور ناپاک تھی تو کیا تھا، اذان تو سب ناپاکیوں کو دھو دیتی ہے ۔ میں کتنی نادان تھی ۔ جب مُراد نے پتھر اُٹھاکر اُسے مارا، پھر علی محمد نے، اور چوہدری اکرم نے، تو میں نے پہلی بار اُس کی ننھی سی چیخ کی آواز سنی ۔ اُس نوزائیدہ کے سر کی ملائم ہڈی جو ایک مُٹھی میں دباکر ٹکڑے ٹکڑے کی جا سکتی تھی، بھاری پتھروں کی مار میں تھی ۔ اُس وقت میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت تھی کہ میں

2009/08/27 22:03

اُن تینوں کا کلیجہ نکال لیتی ۔ مگر ٹانگوں نے جواب دے دیا تھا ۔ میرے حلق سے چیخ بلند ہونے لگی تو آواز بیٹھ گئی ۔ بتا احمد شاہ، بتا، تو اِس بہیمانہ جرم کا مرتکب کیوں ہوا؟"

احمد شاہ کے چہرے پہ بوکھلاہٹ کی جگہ اب سراسیمگی پھیل چکی تھی ۔ اُس کی آنکھوں میں ہراس کے نشان تھے ۔ بات اُس کے مُنہ سے نہ نکلتی تھی ۔ مگر کمال ہے اُس کا کہ اپنے آپ پہ قابو پاکر بولا، "مسجد کی حُرمت کے بارے میں خدا کے سخت احکام ہیں ۔" "حُرمت کے چوکیدار مولوی،" رضیہ سلطانہ چلّاکر بولی، "چار گھنٹے کی معصوم جان خدا کے گھر کی بے حُرمتی کرے گی؟ خُدا کا گھر اِتنا کچا ہے؟ سُن، ہم غریب لوگ ہیں، مگر میں عالموں کے گھرانے کی اولاد ہوں ۔ سُن تیرا خدا کیا کہتا ہے ۔ سورۃ بقر کو یاد کر ۔ یُصوّرکُم فی الارحام ۔ میں ماؤں کے رحموں میں (بچے کی) تصویر بناتا ہوں ۔ احمد شاہ، تم اللہ کی بنائی ہوئی تصویر کو پتھروں سے پاش پاش کرتے ہو اور پاکدامنی کے دعویدار بنتے ہو؟ یہ حق تجھے کس نے دیا ہے؟ تم دوسروں کے گناہوں کا حساب چُکاتے ہو؟ پھر سورۃ بقر کو یاد کرو ۔ تِلکَ اُمّۃٌ قد خَلَت لَھَا مَاکَسَبَت وَلَکُم مَا کَسَبتُم وَلا تُسئَلُونَ عَمّا کانُو یَعمَلُون ۔ وہ ایک اُمّت تھی جو گزر چکی، اُسے ملے گا جو اُس نے کمایا، اور تُمہیں ملے گا جو تُم نے کمایا، اور تم سے نہ پُوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ۔ احمد شاہ، تم کسی شے کے ٹھیکیدار نہیں ہو ۔ بے حُرمتی کی بات کرتے ہو؟ رسُول کی حدیث یاد کرو ۔ فرماتے ہیں بچے کو چپت مت مارو ۔ اور فرماتے ہیں غلافِ کعبہ کی بے حُرمتی سے زیادہ مجھے انسان کی بے حُرمتی کا دُکھ ہوگا ۔ ہائے تم نے میرے ہاتھوں سے بے گناہوں کا خون کرایا ۔ جب تیسرا پتھر میرے بچے پہ گرا تو مَیں غش کھا گئی ۔ اُس وقت اِن لوگوں کے نام بھی مجھے معلوم نہ تھے ۔ مگر اُن چند لمحوں میں اُن کی تصویریں میرے دِل پہ نقش ہو گئی تھیں، میرا دِل پتھر کا بن گیا تھا ۔ جب مجھے ہوش آئے تو سورج سر پر چمک رہا تھا، مسجد کی سیڑھیاں صاف تھیں، کسی شے کا نام و نشان نہ تھا، جیسے میں نے جو دیکھا وہ کوئی خواب تھا ۔ مگر میرے رحم میں جو درد پیدا ہو چکا تھا وہ خواب نہ تھا، اور تین مردوں کی تصویریں میرے اندر موجود تھیں ۔ مجھے نہیں معلوم میں کیسے اُٹھی اور وہاں سے نکلی ۔ جب حواس برابر ہوئے تو میں کماد کے کھیت میں

2009/08/27 22:03

چاروں ہاتھ پاؤں پہ بیٹھی کتے کی طرح وہ زمین کھود رہی تھی جہاں پہ میں نے اپنے بچے کے ناڑ کو دفن کیا تھا ۔ میرے ناخن اُدھڑ گئے تھے، مگر ناڑ میرے ہاتھ میں تھا ۔ میں نے اسے سینے سے لگایا، اپنی چھاتیاں دبا دبا کر دودھ میں اسے نہلایا، مُنہ میں رکھ کر چُوسا، اُنگلیوں سے ٹھونس ٹھونس کر اسے اپنے رحم میں داخل کرنے کی کوشش کی تاکہ دُنیا سے محفوظ ہو جائے ۔ کیا کرتی، اب یہی کچھ میرے ہاتھ میں رہ گیا تھا، باقی سب فنا ہو چکا تھا ۔ اور میرے دِل میں آگ بھر گئی تھی جو ٹھنڈی ہونے کا نام نہ لیتی تھی ۔" احمد شاہ اب غیض و غضب کی حالت میں تھا ۔ "نامُراد گناہگار" وہ چیخا، "اپنا گناہ کیوں میرے سر تھوپتی ہے ۔"

"میں گناہگار ہوں، کب انکار کرتی ہوں،" رضیہ سلطانہ بولی، "وہ لوگ بے گُناہ تھے جِن کا خون میں نے اپنی آگ بُجھانے کے لئے کیا ۔ وہ تو تمہارے کہنے پہ لگے تھے ۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا ۔ مجھے پھانسی لگا دو ۔ اصل قصور وار تو تم ہو۔ آج میں نے اقبالِ جرم کیا ہے ، تمہیں سب کچھ بتا دونگی ۔ تم پوچھو گے میں نے تمہیں کیوں چھوڑ دیا ۔ میرے دِل کی آگ اُن تین بے گناہوں کے خون سے ہی کیوں بُجھ گئی، تمہیں میں نے کیوں نہ پکڑا ۔ تو سُنو ۔ تمہیں میں نے اِس لئے چھوڑ دیا کہ تمہیں تو اپنے ہاتھوں ہی سزا مِل چکی تھی ۔ کان کھول کر سن احمد شاہ، وہ معصوم جسے تم نے اپنی زبان سے ملعون کیا، وہ تمہارا پوتا تھا ۔ کیا؟' احمد شاہ کھلے مُنہ اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اُس پہ لرزہ طاری تھا ۔ 'پوتا؟' 'ہاں ۔ فیروزشاہ کا بچہ تھا ۔ اپنے ہاتھوں تم نے اپنی نسل کُشی کی ۔ یہ ایسی سزا تھی جو میں بھی تمہیں نہیں دے سکتی تھی ۔' 'جُھوٹ ' جھوٹی مکار' احمد شاہ چلایا ۔ 'کرامت علی سے پوچھو' رضیہ سلطانہ نے بازو لمبا کر کے میری طرف اشارہ کیا ۔ 'یہ فیروز شاہ کا یار تھا ۔ گواہ ہے ۔' احمد شاہ نے وحشت بھری نظروں سے مجھے دیکھا ۔ میں بھی ہکا بکا کھڑا تھا ۔ اُس وقت میری نظروں کے سامنے وہ منظر گھوم رہا تھا جب اس واقعے کی اطلاع پاکر پولیس ہمارے گاؤں میں آئی ۔ مگر اُن کے وارد ہونے سے پیشتر ہی اس لرزہ خیز واقعے کے سارے نشان ہوشیاری سے مٹا دیئے گئے تھے ۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا گاؤں کی ساری آبادی نے اِکٹھ کر کے اس واقعے کو اپنے اپنے دامنوں میں چُھپا لیا ہو اور اپنے ذہنوں سے اس کی یاد کو محو کر دیا ہو ۔ تفتیش کے باوجود پولیس کو کوئی سُراغ، کوئی ثبوت، کوئی گواہی

2009/08/27 22:04

حاصل نہ ہو سکی تھی ۔ دباؤ ڈالنے کی خاطر دو چار اِدھر اُدھر کے لوگوں کو پکڑ کر لے گئی تھی، مگر دو ہی روز میں وہ تھانے کی مار کھا کر واپس آگئے تھے ۔ اس عرصے میں میرے خواب و خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ اِس واقعے کا رضیہ سلطانہ اور اُس کے جرائم سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا ۔ رضیہ سلطانہ نے ہم سب کو متعجب کر دیا تھا۔ اُسی حالت میں مَیں نے اثبات میں سر ہلا دیا ۔ احمد شاہ نے پہلے میری، اور پھر رضیہ سلطانہ کی جانب قدم بڑھایا، جیسے مارنے کو آرہا ہو ۔ یکایک رضیہ سلطانہ کی ہیئت میں عجیب و غریب تبدیلی آگئی ۔ ایسے معلوم ہوا جیسے اُس پہ نشے کی کیفیت طاری ہو گئی ہو ۔ اُس کی آنکھیں ذرا سی چڑھ گئیں اور اعضاء تن گئے ۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے بے شرمی سے اپنا نالہ کھولا اور شلوار گرا دی ۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ ٹانگوں کے بیچ داخل کیا اور جھٹکے سے ایک لمبی اور پتلی سی شے اپنے اندر سے برآمد کر لی ۔ بجلی کی مدھم روشنی میں پہلی نظر کے اندر معلوم نہ ہو سکا کہ وہ شے کیا تھی ۔ قدرتی طور پر ہمارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ شائد یہ کوئی اوزار تھا جو اُس نے چُھپا رکھا تھا ۔ اس خیال سے مَیں اور لیڈی وارڈر مسعودہ خانم ایک قدم آگے بڑھے ۔ مگر اُسی وقت رضیہ سلطانہ ہاتھ اُٹھا کر وہ چیز اپنی آنکھوں کے سامنے لے آئی ۔ اُس پہ بجلی کی روشنی پڑی تو ہم نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی سا ہلکے پلاسٹک کا گُڈا تھا جیسا بچوں کے کھیلنے کا ہوتا ہے ۔ اُس کے اِرد گرد موٹا سا دھاگا کَس کر لپیٹا ہوا تھا جیسے اُسے باندھ کر رکھنے کی کوشش کی گئی ہو ۔ کھلونا اُوپر سے نیچے تک گندے خون اور رطوبت میں لتھڑا تھا ۔ اُسے دیکھ کر میرے دل میں اُبکائیاں اُٹھنے لگیں ۔ ساتھ ہی ساتھ مَیں اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ اس چھ سات انچ لمبی شے کو چھپانے کے لئے کیونکر اس عورت نے اپنے اندر جگہ پیدا کر لی تھی، اور کیونکر اتنے عرصے میں ہمیں اِس بات کا علم نہ ہو سکا تھا ۔ مسعودہ خانم نے بھی حلق سے ایسی آواز پیدا کی جیسے اُس کے دل کو دھچکا لگا ہو ۔ ہم جیل کے ملازم تھے، ہوئے تھے کہ ہم نے چوروں ڈاکوؤں اور قاتلوں کے اِس گڑھ میں زندگی کی ہر بُری بھلی چیز دیکھ لی ہے ۔ مگر ایسا نظارہ ہم نے بھی کبھی نہ دیکھا تھا ۔ ہم سب مُنہ کھولے وہاں کھڑے ہی تھے کہ رضیہ سُلطانہ کا بدن ایسے تڑپا جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو ۔ وہ اپنی تنکی ٹانگوں پہ ایک جست بھر کر احمد شاہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔

2009/08/27 22:04

"او مولوی،" وہ چنگھاڑی، "دیکھ یہ تیرا پوتا ہے ۔" اُس نے وہ گُڑ احمد شاہ کی ڈاڑھی میں گھسا دیا ۔ "اِس کے ناڑ کو میں نے چھاؤں میں سُکھایا ہے، اور اس میں باندھ کر اپنی کوکھ میں لئے پھرتی ہوں ۔ یہ میری محبت کی نشانی ہے ۔ مَیں کیسے توبہ کروں ۔ ناپاک ہُوں ۔"

احمد شاہ کا سر گردن کے اُپر کانپ رہا تھا ۔ اُس کے چہرے پر وحشت تیزی سے پھیل رہی تھی ۔ اُس وقت میں نے ایک عجیب منظر دیکھا ۔ مَیں نے ایک اچھے بھلے سیانے آدمی کو لمحوں کے اندر دیوانگی کی حالت میں اُترتے دیکھا ۔ اُس کی آنکھوں میں درندگی کی چمک اُمڈ آئی تھی ۔ اُس نے دھکا دے کر رضیہ سلطانہ کو زمین پر گرا دیا اور اُلٹے پاؤں "مردود، قیدی، مردود، مردود، قیدی، قیدی قیدی،" کے نعرے لگاتا ہوا بھاگ نکلا ۔ رضیہ سلطانہ جہاں گری تھی وہیں پہ بے حیائی سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھی رہی ۔ اُس کی رانوں پہ خون کے چٹاخ دکھائی دے رہے تھے ۔ مسعودہ خانم لیڈی وارڈر نے بمشکل اُسے شلوار پہنائی ۔ پھر میں اور مسعودہ خانم کوٹھڑی کو مقفل کر کے واپس چلے آئے ۔ گیٹ تک آتے آتے ہم نے رستے میں احمد شاہ کی بکھری ہوئی چیزیں دیکھیں ۔ چارخانہ رومال، ایک کھیڑی جس کا پٹا ٹوٹ چکا تھا، مصنوعی داتوں کا پیڑھ ۔ ہم انہیں اٹھا کر دفتر میں لے آئے ۔

دفتر میں ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ جیل کے باہر ایک مسجد کے سپیکر پر مؤذن نے اذان دینی شروع کر دی تھی ۔ پھانسی کا وقت قریب آرہا تھا ۔ ایک آدھ گھنٹے میں عملہ اکٹھا ہونا شروع ہو جائے گا ۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، مجسٹریٹ، ڈاکٹر، جلاد ۔ میرے دِل کو چین نہ آرہا تھا ۔ مَیں اُٹھ کر پھر رضیہ سلطانہ کی کوٹھڑی کو گیا ۔ وہ اب اپنے آپ کو سمیٹے پاؤں کے بل دیوار کے سہارے سے بیٹھی تھی ۔ اُسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اب وہ پورے طور سنبھل گئی تھی ۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا، گویا تیار بیٹھی تھی ۔ جب وہ بولی تو مجھے اپنی پُرانی والی رضیہ کی کھڑکتی ہوئی آواز سُنائی دی ۔

"سب آ گئے؟"

"نہیں،" میں نے جواب دیا ۔ "بس میں تمہیں دیکھنے آیا ہوں ۔ کیا بجا ہے؟"

2009/08/27 22:04

"پونے تین ہو رہے ہیں ۔"

"چلو" وہ بولی، "یہ رات بھی گئی ۔"

"رجّو" میں نے اس سے کہا، "ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ بتاؤگی؟"

"ہاں کرامت ۔"

"تم نے فیروز شاہ سے شادی کیوں نہ کی،" میں نے پوچھا ۔

"کیوں کرتی،" وہ پھٹ سے بولی ۔ "ساری دُنیا کا درد دِل میں لئے پھرتا تھا، جب میرے پاس آتا دو منٹ میں لُڑھک جاتا اور مُنہ پرے کر کے خراٹے لینے لگتا تھا، جیسے میں کوئی حیوان ہوں، یا کوئی پتھر کی سِل ہُوں جس پہ رگڑ کر چٹنی بنائی، کھائی، اور پرے کھڑی کر دی ۔ مَیں آدم زاد ہوں، حیوان نہیں ہوں ۔"

"مگر تمہیں اُس سے محبت تو تھی رجّو" مَیں نے کہا ۔

"محبت کا کیا ہے،" وہ بولی، "ایک بار ہو گئی تو ہو گئی ۔ اُس کے بعد تو سلوک کی بات ہوتی ہے ۔ سلوک کا تم لوگوں کو کیا علم؟ ایک بات بتاؤ میں تم سے پوچھتی ہوں ۔ تم لوگوں کو دُنیا بھر کی فکر لگی رہتی ہے ۔ عوام عوام کرتے تمہاری باری نہیں آتی ۔ ذرا بتاؤ عوام کون لوگ ہوتے ہیں؟"

میرا حلق سوکھ رہا تھا ۔ اُس نے میری جواب طلبی شروع کر دی تھی ۔ "عام لوگ ہوتے ہیں،" میں نے جواب دیا ۔

"ایسے نہیں ۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ۔" وہ اٹھ کر کوٹھڑی کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی ۔ "سُنو ۔ ایک بار میں نے فیروز شاہ سے یہ سوال پُوچھا تھا ۔ اُس نے بھی یہی جواب دیا تھا ۔ پھر میں نے دوہرا کر پُوچھا تو بولا، غریب لوگ، ریڑھی والا تانگے والا، رکشا چلانے والا، چپڑاسی، کلرک، غریب دُکاندار، فیکٹری کا مزدور، غریب کسان، مال ڈھونے والا ۔ میں نے پوچھا اور؟ تو بولا سٹیشن کا قُلی، ڈاکیہ، بس ڈرائیور ۔ پھر میں نے پوچھا اور؟ بولا پھیری لگانے والے، لوہا کوٹنے والے، بجلی کا میٹر پڑھنے والے، کرسیاں بنانے والے، پولیس کے سپاہی، چارپائیاں بُننے والے، برتن قلعی کرنے والے ۔ میں نے پوچھا اور تو چِڑ گیا ۔ بولا اور اور لگا رکھی ہے ۔ کیا مطلب ہے تُمھارا ۔ میں نے کہا، اور عورتیں؟ اِس پر وہ کچھ حیران ہوا ۔ پھر بولا، ہاں عورتیں ۔ مَیں اُس وقت ہنس دی ۔ پگلے نے بے خودی میں سچّی بات کہہ دی تھی ۔ تُمھارے عوام میں ہم لوگ کہاں شامل ہوتی ہیں ۔" مَیں خاموش رہا ۔ بولی ۔ "ہم لوگ احساسِ کمتری لے کر پیدا ہوتی

2009/08/27 22:05

ہیں ۔ کوئی ہاتھ لگا جائے تو دوسروں کے مُنہ کی طرف دیکھتی ہیں ۔ مردوں کے مُنہ پر بال نکلتے ہیں تو فخر سے دُنیا کو دکھاتے ہیں ۔ ہمارے منہ پر ایک بال اگ آئے تو شرم سے سر جُھکا لیتی ہیں ۔ ہماری چھاتیاں نکلتی ہیں تو شرم سے سر جُھکا لیتی ہیں ۔ خُون جاری ہوتا ہے تو شرم سے جُھک جاتی ہیں ۔ شادی کی رات گزرتی ہے تو شرم سے باہر نہیں نکلتیں ۔ اِس سے بڑی غُربت کیا ہوتی ہے؟"

وہ رُک گئی ۔ مَیں نے دیکھا کہ وہ کان لگا کر کچھ سُننے لگی تھی ۔ مَیں بھی سُننے لگا ۔ باہر مسجد کے سپیکر پر کسی کی اچانک موت کا اعلان ہو رہا تھا ۔ جنازہ صبح دس بجے اُٹھنا تھا ۔

"تُم نے کوئی جنازہ دیکھا ہے؟" وہ بولی ۔

"کئی بار دیکھا ہے ۔" میں نے جواب دیا ۔

اس پر رضیہ کے لہجے میں افسوس کی ہلکی سی جھلک پیدا ہوئی ۔ کہنے لگی ۔ "آپ لوگ صفیں باندھ کر ایک جسدِ خاکی کو خدا کے سپرد کرتے ہیں ۔ ہم جو جانکنی سے گزر کر زندگی کو پیدا کرتی ہیں ، تماشائیوں کی طرح ایک طرف کو کھڑی ہوتی ہیں اور بین کرتی ہیں ۔' پھر اس کے لہجے میں وہی جاندار کھنک واپس مڑ آئی ۔ "تم کہتے ہو شادی کیوں نہ کی؟ ایسے آدمیوں سے میں نے کیا لینا ہے ۔ کہتے ہو محبت ہوئی تھی ۔ محبت کہاں رہتی ہے ۔ اِس کی نشانیاں رہ جاتی ہیں ۔ بس ہم لوگ اپنی محبت کی نشانیوں سے چمٹی رہتی ہیں ۔'

میرے دل میں کوئی بات نہ بن رہی تھی ۔ میں خاموش ہو کر چلا آیا ۔

جب پھانسی کا وقت آیا تو وہ عملے کے آگے کھٹ پٹ چلتی کوٹھڑی سے نکل گئی ۔ جیل خانے کا دستور ہے جس روز علی الصبح پھانسی لگنی ہوتی ہے اُس رات کو سب 'کوٹھی' والے جاگتے ہیں اور قرآن کریم کی تلاوت کرکے بخشتے رہتے ہیں ۔ یہ ایک موقعہ تھا جب میں نے دیکھا کہ وہ اِس دستور سے ہٹ گئے تھے ۔ کسی نے تلاوت نہ کی' گو رات بھر رضیہ سلطانہ اور احمد شاہ کی باتوں کی آواز ان کے کان میں پڑتی رہی تھی ۔ جب رضیہ اُن کے آگے سے گزر رہی تھی تو سب جاگ رہے تھے ، مگر اپنی کوٹھڑیوں کے دروازوں پر خاموش کھڑے تھے ۔ اُن کی نظریں بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ، جیسے کہہ رہی ہوں ، جانے دو ، مر رہے ۔ شروع سے ہی اُن کے اندر رضیہ سلطانہ کے لئے وہ جذبہ موجود نہ ہو کسی

by faisal oneurdu.com
2009/08/27 22:05
Created with Visual Watermark

دوسرے کو ٹھی والے کی خاطر ہوتا ہے ۔ ایک تو عورت ہو کر اس نے تین مردوں کو قتل کیا تھا' اور پھر استغفار سے بھی انکاری تھی ۔

ٹھیک چار بجے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، مجسٹریٹ اور ڈاکٹر کی موجودگی میں رضیہ سلطانہ کو پھانسی لگ گئی ۔ میں وہاں موجود نہیں تھا، پہلے ہی بیماری کا بہانہ کر کے گھر واپس چلا آیا تھا ۔ وہ واقعہ جو رات کو پیش آیا اُس کی سوائے میرے اور مسعودہ خانم لیڈی وارڈر کے کسی کو پوری خبر نہ ملی ۔ اگلے روز مقامی اخبار میں چھوٹی سی خبر چھپی ۔

"شالامار کی بدنام قاتلہ رضیہ سلطانہ عُرف رجو میر کو کل صبح چار بجے پھانسی پر چڑھا دیا گیا ۔ آخری دم تک مجرمہ نے عدم تعاون کا رویہ رکھا اور کوئی بات منہ سے بیان نہ کی ۔ کسی کو علم نہ ہو سکا کہ اس نے کس وجہ کی بناپر ایسے انسان سوز جرائم کا ارتکاب کیا ۔ یہ راز مرحومہ رضیہ سلطانہ اپنے سینے میں ہی لے کر دُنیائے فانی سے کُوچ کر گئی ۔"

پیر کرامت علی شاہ نے کہانی ختم کر کے سر اُٹھایا تو اُن کے چہرے پر ایک فخریہ انداز تھا، گویا کامیابی سے داستان مکمل کر کے انہوں نے کارنامہ انجام دیا ہو ۔ سلامت علی محویت کے عالم میں آگے جُھک کر بیٹھا سن رہا تھا ۔

"پھر؟" اُس نے پوچھا ۔ یہ لفظ اُس کے مُنہ سے نکلنا ہی تھا کہ پیر کرامت علی کا رنگ بدل گیا، جیسے کسی ان دیکھے ہاتھ نے اُنہیں بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور زمانۂ حال میں لا پٹکا ہو ۔ اُن کے چہرے پہ ہزیمت کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے ۔

"بس،" وہ بولے، "بس ۔" اُنہیں کوئی بات نہ سُوجھ رہی تھی وہ ایک بار ہکلاتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر لفظ ادا نہ ہوئے ۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سراسیمگی جس کا ذکر وہ کچھ دیر پہلے احمد شاہ کی مَد میں کر رہے تھے، اُن کے اپنے اندر سرائیت کرتی جا رہی تھی ۔

"بس؟" سلامت علی نے دوہرا کر پوچھا ۔

پیر کرامت علی کے لئے راہ فرار نہ رہی تو کہنے لگے ۔ "بس یہی کہانی ہے ۔ اس کے آگے جو کچھ ہوا، وہ میری سمجھ سے باہر ہے ۔" اُن کی آواز پھر ٹوٹ کر چھوٹی تھی

2009/08/27 22:05

"کیا ہوا شاہ جی؟"

"اس بات کو رہنے دو" پیر کرامت علی بولے، "کیوں اصرار کرتے ہو۔"

"مجھے بتاؤ شاہ جی۔"

"میں بتا ہی چکا ہوں۔ اور کیا بتاؤں۔ میں اب کسی لائق نہیں رہا۔"

"شاہ جی، اُس عورت نے آپ کے ساتھ کیا کیا، میری سمجھ سے یہ بالاتر ہے۔"

"اُس نے کیا کرنا تھا۔ میرے اپنے نفس کی بات ہے۔" پیر کرامت علی نے کہا۔ "کیا بات ہے۔" سلامت علی نے اصرار کیا۔ پیر کرامت علی نے لاچاری سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ آخر انہیں بولنا ہی پڑا۔ "میں ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس واقعے کو کئی روز گزر گئے۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اُس بد بخت کا منظر میرے دل پر بیٹھتا جا رہا ہے۔ میں اپنے ازدواجی حقوق حاصل کرنے کو جاتا تو وہ لہو میں لتھڑا ہوا گڈا جو اُس نے خدا جانے اپنی کس کوکھ سے کھینچ کر نکالا تھا، میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ ساتھ ہی میرے اعضاء میں ٹیس اُٹھنی شروع ہو جاتی، جیسے وہاں زخم پیدا ہو گئے ہوں۔ میرے پٹھے سُکڑ جاتے۔ میں نے خیال کیا وقت کی بات ہے، وقت گزر جائے گا۔ مگر یہ منظر تو میری آنکھوں کے پردوں پر پتھر کی لکیر کی طرح جم گیا تھا۔ لاکھ حیلے کئے، یہ مدھم نہ پڑا، نہ اس کا اثر کم ہوا۔ ایک نوزائیدہ کے ناڑ میں بندھا ہوا وہ کھلونا جس سے خون اور رطوبتوں کے قطرے ٹپک رہے تھے، میری مردانگی کا سرقہ کر کے لے گیا۔ مجھے ہر عورت کی رانوں پہ گندے خون کے چٹاخ نظر آتے ہیں۔ کئی مہینے گزر گئے تو آخر مجھے پتا چلا کہ میں اب ہمیشہ کے لئے عورت کے ناقابل ہو چکا ہوں۔

اب کے سلامت علی نے آگے پوچھنے پر اصرار کیا نہ جواب طلب نظروں ہی سے اپنے باپ کو دیکھا، بلکہ سر جھکائے بیٹھا فرش پہ بے خیالی سے کھینچتا رہا۔ اب پیر کرامت علی شاہ کی نظریں اپنے بیٹے پہ لگی تھیں۔ ان میں ایک التجا تھی۔ پیر کرامت علی شاہ نے ایک عمر ہوئی کسی سے التجا کی تھی۔ ہزاروں ملتجی نظروں کو وہ خود روزانہ ہاتھ اُٹھا کر فیض پہنچاتے خدا کے فضل و کرم سے ہمکنار کرتے تھے۔ مگر صاحبزادہ سلامت علی شاہ کی بات اور تھی۔ وہ اُن کی گدی کا وارث تھا۔ وہ اُس سے اپنی بخشش کے طلبگار تھے۔

"اُس ایک عورت نے مجھے زندگی بھر کی قید میں ڈال رکھا ہے۔ وہ

2009/08/27 22:05

بولے ۔ "اب میں صرف ان کے بدن پر ہاتھ پھیرتا ہوں ۔ اور کچھ نہیں کرتا ۔ انھیں پاک صاف چھوڑ دیتا ہوں ۔ نسرین کو بے اُمید نہیں لوٹا سکتا تھا ۔ کسی غلط خیال کو دل پر مت لگاؤ ۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

سلامت علی ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ، ان کی طرف دیکھے بغیر اٹھا اور کمرے سے نکل آیا ۔ پیر کرامت علی کی لاچار نظریں دروازے تک اُس کا تعاقب کرتی رہیں ۔ جب سلامت علی حُجرے سے نکل رہا تھا تو اُس نے سائیں نانگے کو دروازے کے پیچھے کھڑے پایا ، جیسے دیر سے چُھپ کر کھڑا ہو ۔ ایک لمحے کی حیرت سے اس نے سائیں نانگے کو دیکھا ، اور باہر نکل آیا ۔ احاطے میں پہنچ کر اس نے ایک لمبی سانس کھینچی ۔ آسمان پہ پچھلی رات کے ٹوٹے پھوٹے چاند کو دیکھ کر اس کے دل سے پچھلی راتوں کے کئی گنڈ خیال گزرے ۔ تازی ، جواب تین بچوں کی ماں بن چکی تھی ۔ مچھر دانی کی موری جہاں سے مچھر اندر گھس کر کان میں شور مچاتے تھے ۔ ایک ویران کنوئیں کا منظر ۔ ۔ سلامت علی کے دل میں عجیب سی مُردنی کا اثر تھا ، جیسے خیال آ رہا ہو کہ جادوؤں کے ٹوٹنے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ۔

حُجرے کے اندر پیر کرامت علی شاہ کا دل بیٹھتا ہی چلا جا رہا تھا ، جیسے بیٹے کے دل کی مُردنی پھیل کر ان کے بدن پہ طاری ہوتی جا رہی ہو ۔ یہ زندگی میں پہلی بار تھی کہ ان کا بیٹا ان کی بات کو چھوڑ کر اٹھ گیا تھا ۔ کچھ دیر کے بعد وہ جہاں بیٹھے تھے وہیں پہ ڈھے گئے ، پہلو کے بل سکڑ کر لیٹ گئے اور بازو پہ سر رکھ کر خواب میں چلے گئے ۔ خواب کی حالت میں انہوں نے کئی الٹے سیدھے منظر دیکھے ، جن میں عورتوں کے سینکڑوں بے لباس جسم بھی تھے جو خون کے چھوٹے بڑے دھبوں سے ڈھکے پڑے تھے ۔

صبح سویرے سلامت علی کو ایک نوکر نے آ کر جگایا تو کاؤں کاؤں کہرام مچا تھا ۔ پیر کرامت علی شاہ بابا چدر والے اپنے حُجرے میں مردہ پائے گئے تھے ۔ ان کے جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرتی موت مرے ہیں ۔ یہی رپورٹ قانونی کاغذات میں بھی تحریر میں آئی ۔

بابا چدر والے کے گزرنے کی خبر آس پاس کے کاؤں میں جنگل کی طرح پھیل رہی تھی ۔ لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر کچے کھوہ کی گدی کو چلے آ رہے

2009/08/27 22:06

تھے ۔ عورتیں بین کر رہی تھیں ۔ ایک قیامت کا سماں تھا ۔ دیکھنے والوں کا کہنا تھا کہ موت کی حالت میں بابا چدّر والے کے چہرے پہ جو نور تھا پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ رحمت کا فرشتہ نازل ہوا اور پیر صاحب کی رُوح کو اپنے ہاتھوں میں لے کر فردوس بریں کو پرواز کر گیا ۔

اُس لحظے مغرب کی جانب سے ایک اور جنازہ اٹھا چلا آ رہا تھا ۔ یہ سائیں نانگے کا جنازہ تھا ۔ اُس کی لاش کچّے کھوہ سے چار کوس کے فاصلے پر کچی سڑک کے کنارے پڑی ہوئی ملی تھی ۔ یہ سڑک رکھوال کو جاتی تھی ۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ سائیں نانگا رکھوال کا رُخ کر رہا تھا کہ کسی وجہ سے راستے میں ہی گر کر مر گیا ۔ اُس کے بدن پہ بھی کوئی ضرب کا نشان نہ تھا ، اور چہرے پہ ایک ہونق سی مسکراہٹ کا اثر تھا ۔ کچّے کھوہ کو آتے ہوئے کچھ لوگوں نے اُس کی لاش کو اُٹھا کر چارپائی پہ ڈالا اور گدی پہ لے آئے ۔ کچا کھوہ پہنچ کر سائیں نانگے کی لاش کو بھی دفنانے کے لئے احاطے میں ایک طرف کو رکھ دیا گیا ۔

۔ ۔ ۔ چارپائی کے اوپر ایک کھیس پھیلا کر لاش کو ڈھک دیا گیا ۔ کچھ دیر تک وہ لوگ جو اسے اٹھا کر لائے تھے ارد گرد بیٹھے رہے ، پھر اُٹھ کر کھانے پینے کی غرض سے دربار کے لنگر کو چلے گئے ۔ واپسی پر وہ بابا چدّر والے کے جسدِ خاکی کی زیارت کرنے والے ہجوم میں شامل ہو گئے ۔ جنازے کا انتظام کرنے والے عملے میں سے کسی نے چارپائی خالی دیکھ کر کچھ کھیسوں ، چادروں اور تکیوں کے بنڈل لاکر چارپائی کے اُوپر ڈھیر کر دیے ۔ کچھ دیر کے بعد ہجوم میں مزید اضافہ ہوا تو لنگر والوں کو اپنے کام کے لئے جگہ کی تلاش شروع ہوئی ۔ اُن کے آدمیوں نے کھیس کے ڈھیروں کو ترتیب دے کر جگہ ہموار کی اور اُس کے اُوپر کچی سبزی کے تھال لا رکھے ۔ ارد گرد انہوں نے پینے کے پانی کے گھڑے رکھ کر حصار باندھ دیا تاکہ اُس کے اندر خوراک کے تھال محفوظ رہیں ۔ پھر چارپائی کے گرد چوکیوں پہ بیٹھ کر پیاز اور لہسن چھیلنے اور سبزیاں کاٹنے لگے

کہا جاتا ہے کہ بابا چدّر والے کے جنازے کی افراتفری اور آہ و بکا کے اندر سائیں نانگے کی لاش بھول بھلا گئی اور کئی روز تک ایک کھیس کے نیچے چارپائی پہ پڑی رہی ۔ چارپائی ڈھیلی ڈھالی تھی ۔ سائیں نانگے کی منحنی سی کھیس تلے معلوم نہ پڑتی تھی ۔ کسی نے دیکھا بھی تو خیال کیا کوئی بچہ سویا ہے ۔ آخر جب چارپائی کو اٹھانے کی ضرورت پڑی تو کھیس کو الٹایا گیا ۔ دیکھنے والوں کی

2009/08/27 22:06

بات رہے کہ دو آدمی وہاں کھڑے کھڑے بیہوش ہو کر گر پڑے ۔ باقی کے بھاگ کر کچھ دور جا کھڑے ہوئے ۔ دہشت کے مارے اُن کی زبانیں بند ہوگئیں ۔ سائیں نانگے کی نعش پہ کیڑے رینگ رہے تھے، گو اُس کا چہرہ سلامت تھا اور اُس پہ وہی ہونق سی مُسکراہٹ بکھری تھی ۔

ایک خادم نے جاکر صاحبزادہ سلامت علی کو خبر کی ۔ وہ آئے اور ایک منٹ تک نعش کو دیکھتے رہے ۔ پھر اُنہوں نے دفنانے کا حکم جاری کیا اور واپس چلے گئے ۔ احاطے کے ایک کونے میں، جہاں نظر نہ جاتی تھی ، جلدی سے قبر کھودی گئی ۔ نئی چادر میں سائیں نانگے کو کفنا کر تیرہ چودہ آدمیوں نے ایک درویش لڑکے کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی ۔ پھر خاموشی سے سائیں نانگے کو دفن کر دیا گیا ۔

حُجرے کی جگہ پہ مزار کی تعمیر کا کام شروع ہو چُکا تھا ۔

2009/08/27 22:06

اختتامیہ

رسمِ چہلم کا منظر :۔

کچے کھوہ میں سینکڑوں کا مجمع تھا ۔ پیر کرامت علی شاہ کے چہلم تھے ۔ ساتھ ہی صاحبزادہ سلامت علی شاہ کے عروس منعقد ہو رہے تھے ۔ ختمِ چہلم کے ایک گھنٹہ بعد سلامت علی شاہ کی گدی نشینی کی رسم ادا ہونا تھی ۔ جوق در جوق مُرید اور معتقدین وارد ہو رہے تھے ۔ لوگوں کا جلسہ دربار کے احاطے سے نکل کر گاؤں بھر میں پھیل چُکا تھا ۔ آدھے احاطے کے اندر کھانا پک رہا تھا، جہاں سو کے قریب دیگیں چڑھی تھیں ۔ باقی کے آدھے حصّے میں، جو کوئی لیک لیکڑ کے رقبے پر محیط تھا، قناتیں لگی تھیں، جن کے اُوپر وسیع و عریض تنبو سایہ کئے ہوئے تھے ۔ ان کے اندر ایک سرے پر تین چار چھوٹی قناتیں استوار تھیں ۔ جن سے خواص کی نشست کے لئے ایک 'کمرہ' تیار کیا گیا تھا جو کمرے کے طور پر ہی سجایا گیا تھا ۔ زمین پر سرخ قالین بچھے تھے اور ارد گرد لمبے لمبے صوفے رکھے ہوئے تھے ۔ صوفوں کے آگے میزیں بچھی تھیں ۔ میزوں پر گلدان اور گلدانوں میں پھُولوں کے گلدستے سجے تھے ۔ ایک طرف پیتل کا چمکتا ہوا پیچواں حُقہ کھڑا تھا ۔ بیچ میں ایک لمبے چوڑے قالین پر دو گاؤ تکئے پڑے تھے اور باقی کی جگہ خالی تھی ۔ یہ جگہ قوالوں کے لئے مخصوص تھی ۔ دستار بندی کی رسم کے فوراً بعد قوالی کا وقت مقرر تھا ۔

دربار پر قوالیاں ہر تیسرے چوتھے منعقد ہوتی رہتی تھیں ۔ مگر آج کے بعد صاحبزادہ صاحب کے حکم پر چہلم تک کے لئے بند کی جا چکی تھیں چنانچہ آج کا دن قوالیوں کے لئے خاص الخاص موقع تھا ۔ اس مقصد کے لئے قوالوں کی دو ٹولیاں پچھلے تین روز سے گاؤں میں مقیم تھیں ۔ اُن کی رہائش کا بندوبست گاؤں میں ایک علیحدہ مکان کے اندر کیا گیا تھا، اور خورد و نوش کے لنگر کی

2009/08/27 22:07

بجائے ان کا کھانا گھر سے پک کر جاتا تھا ۔ خوراک میں مُرغن کھانوں کے علاوہ قوالوں کی خاص فرمائش پر تازہ مکھن کے پیڑے بھیجے جاتے تھے ۔ قوالیوں کا علم رکھنے والے جانتے تھے ۔ کہ چھ چھ گھنٹے تک سینے کا زور لگانے والوں کے لئے تازہ مکھن کے پیڑے خوراک کا لازمی جزو ہوا کرتے تھے ۔ سارے جلسے کو خبر تھی کہ قوالیاں شام سے شروع ہو کر رات بھر جاری رہیں گی ۔ ان کے اشتیاق میں ختمِ چہلم کے ہجوم نے ایک میلے کی شکل اختیار کر رکھی تھی ۔ پیر صاحب کی حیات کے دوران قوالیاں عموماً حُجرے کے سامنے میدان میں ہوا کرتی تھیں ۔ پیر صاحب ایک روغنی پلنگ پہ تشریف فرما ہوتے تھے ۔ باقی سب چھوٹے بڑے سمیت قوال نیچے دریوں اور چادروں پہ بیٹھتے تھے ۔ کبھی پیر صاحب پلنگ پہ نیم دراز ہو جاتے اور کسی مُرید پہ خاص نظرِ عنایت پڑتی تو اسے اشارہ کرتے ۔ وہ آدمی اُٹھ کر پلنگ کی چوکاٹھ پہ بیٹھ جاتا اور پیر صاحب کے پاؤں دبانے لگتا ۔ عام طور پہ قوالوں کی بیٹھک مغرب کی نماز کے فوراً بعد شروع ہوتی ۔ پہلے ایک دو گھنٹے سماں باندھنے میں صرف ہو جاتے ، پھر نمازِ عشاء کے لئے مجلس برخاست ہوتی ۔ نماز کے بعد قوال کچھ ہلکا کھانا تناول کرتے اور اصل محفل کا آغاز ہوتا ۔ اگر قوالوں کی دو ٹولیاں موجود ہوتیں، تو پہلے کچھ کم درجہ کی ٹولی حاضر ہوتی اور گھنٹہ دو گھنٹہ قوالی کرتی ۔ پھر فارغ ہو کر ایک طرف کو بیٹھ جاتی اس کے بعد بڑے قوال آتے اور اپنی محفل شروع کرتے ۔ اُن کی اوّلین سُر کے اٹھنے کے ساتھ ہی سامعین کو اُن کے درجے کا احساس ہو جاتا اور مجمعے پہ ایک پر سکوت خاموشی چھا جاتی ۔ چونکہ قوالیوں کا انداز خُدا اور رسول اور ان کا قرب رکھنے والے محبوب بندوں کی مدح سرائی کا ہوتا ، اس لئے رات کا یہ وقت اور سناٹا روحانیت کا پُر شکوہ ماحول قائم کرنے کے لئے عین موزوں ہوتا تھا ۔ پچھلی رات کا وقت ہوتا اور قوالوں کے گلے کی سُرتان اور دل میں ہلچل مچا دینے والی نعتیں اور [illegible] اپنے عروج پہ ہوتیں تو سامعین میں کسی کسی پہ ، یا عورتوں کے ٹولے میں [illegible] مدح رسول سنتی ہوئی کسی نکّی عمر کی فقیرنی یا جنّ کے سائے والی عورت پہ [illegible] عالم طاری ہو جاتا ۔ اس عالم میں وہ مست عورت یا مرد اپنے سر یا اُوپر [illegible] تیزی سے گول گول گھمانے اور 'حق ۔ ہُو' کے نعرے لگانے شروع کر دیتا، [illegible] سے آس پاس ایک ہلچل مچ جاتی ۔ ان مست شخصوں میں سے کبھی کوئی اُٹھ [illegible] ہوتا اور اُچھلنے کودنے اور اپنی الگ تانیں اُٹھانا شروع کر دیتا ۔ پھر ساتھ [illegible] نے

لوگ اُسے نرم ہاتھوں پکڑ کر آرام سے زمین پر لٹا دیتے اور اُس کے اوپر بیٹھ جاتے ۔ اس طرح وہ جلدی سے اس کی سانس روک کر قابو میں کر لیتے اور اس کی حرکات کو قوالی میں خلل انداز نہ ہونے دیتے ، بلکہ اس کے برعکس ان مستوں کی موجودگی محفل میں خدا کی بندگی اور تقدس کا سماں پیدا کرنے میں اضافت کے طور پر کام کرتی اور مجمعے پر روحانیت کا اثر مزید بڑھ جاتا ۔ قوالی عموماً دو تین بجے تک چلتی، اور کبھی فجر کی نماز تک جاری رہتی ۔ جب قوالی ختم ہوتی تو جذبات کے اس طویل اتار چڑھاؤ کی بدولت سامعین کے دل اور دماغ خالی ہو چکے ہوتے تھے ۔ اُن کے دِل بُغض اور کدورت سے پاک اور بدن آلائشوں سے دُھل چکے ہوتے اور وہ اس دُنیا کی قید اور اس کی مشقت سے بے خبر ہو کر آنے والی دُنیا کے پُر لطف تصور میں رچے بسے ہوئے گھروں کو لوٹتے ، جبکہ قوالوں کے پیٹ اُس وقت بُھوک سے کُڑ کُڑا رہے ہوتے ۔ وہ جلدی سے قیام گاہ پہ پہنچ کر گھی میں تر پلاؤ اور بُھنے ہوئے مرغوں پہ پل پڑتے ، سینے کی خرچ شدہ قوت کو بحال کرنے کی خاطر مکھن کے پیڑے نوش کرتے ، اور اس کے بعد آرام کی نیند سو جاتے ۔ پیر صاحب کبھی قوالی کے دوران ہی اُٹھ کر تشریف لے جاتے ، اور اگر قوال ان کی پسند کے ہوتے تو تا دیر بیٹھے رہتے ۔ قوالی سے وہ حسبِ معمول حجرے میں جاتے اور غرض مندوں کی جانب اپنی توجہ مبذول کر دیتے ، دم پھونک کرتے، تعویز دیتے، اور ان سے فارغ ہو کر استخارے کے عوامل کی تکمیل کرتے تھے ۔ دن کا بیشتر حصہ وہ آرام و استراحت کی حالت میں بسر کیا کرتے تھے ۔

آج کے دن کے لئے صاحبزادہ صاحب کے حکم کے مطابق قوالوں کا مقام مقرر شدہ جگہ سے ہٹا کر اُس قنات در قنات کمرے میں منتقل کیا جا چکا تھا جس خاص موقع پر معزز مدعوئین میں پیر جسامت علی شاہ کے علاوہ چوہدری محمد خاں، جو حلقے کے نئے ایم ۔ این ۔ اے تھے ۔ اور حال ہی میں زرعی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لینے کے مقدمہ میں ضمانت پر رہا ہو کر آئے تھے، کی شرکت متوقع تھی ۔ موقع کی اہمیت کے پیش نظر مُلک کے چوٹی کے قوال مصور علی اور علی برادران اور اُن کے سازندے آج ہی دو کاروں میں گاؤں پہنچے تھے اور اس وقت کھانے سے فارغ ہو کر سوئے پڑے تھے ۔ صاحبزادہ نے قوالوں کے لئے خاص حکم جاری کر رکھا تھا کہ اُن کا تخاطب پیر صاحب جسامت علی شاہ اور چوہدری امتیاز

2009/08/27 22:08